شاہ ولی اللہ کے تعلیمی نظریات

جناب محمد نعیم صاحب صدیقی ندوی ایم، اے (علیگ)
رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں مقصود بالذات علوم یعنی حدیث و تفسیر سے جو بُعد اور منطق و فلسفہ سے جو خصوصی اعتنا پایا جاتا ہے وہ ہمیشہ ہی اس کی خصوصیت رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ لودیوں کے عہد تک منطق و کلام کی تعلیم بہت ہی برائے نام ہوتی تھی اور غالباً اس فن میں صرف دو ہی کتابیں قطبی اور شرح صحائف داخل درس تھیں۔

اس کے بعد پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب سکندر لودی سریر آرائے حکومت ہوا تو علوم عقلیہ کا عروج شروع ہوا۔ عہد اسلامی کا شہرۂ آفاق مورخ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے۔

"ہندوستان میں معقولات کا فروغ سکندر لودی کے عہد میں شیخ عزیز اللہ اور شیخ عبداللہ کے ذریعہ ہوا سکندر خود بھی علم کا بہت شائق اور علما نواز حکمراں تھا۔"

پھر جب ہندوستان کے سیاسی مطلع پر مغلوں کا آفتاب اقبال ضو فگن ہوا تو اہل نظر سے مخفی نہیں کہ ہمایوں بادشاہ عقلی علوم کا بے حد دلدادہ تھا۔ اور الناس علی دین ملوکہم کے مصداق ہمیشہ دینی علوم اور طریقہ عام ہوئے جو وقت کے اقتضا

علمی کی دلچسپی کا باعث رہے ہمایوں نے ان علوم کو فروغ دینے میں کلی توجہ صرف کی —
ہمایوں کے بعد عہد اکبری میں جہاں دوسرے فکری و ذہنی انقلابات رونما ہوئے
ہیں اس کا اثر ہمارے نصابِ تعلیم پر بھی بہت گہرا پڑا بقول بدایونی "اکبر کا ایوان
حکومت فلسفہ و حکمت کے ترانوں سے گونج اٹھا"
اسی اثنا میں شاہ فتح اللہ شیرازی جو علوم عقلیہ میں مفقود النظیر تھے ہندوستان
آئے۔ اکبر نے انھیں صدر الصدور کے منصب پر فائز کیا۔ شاہ شیرازی نے
ہندوستان میں عقلی علوم کو فروغ دینے اور انھیں عام کرنے کے لئے بے انتہا
جد و جہد کی جس کے نتیجہ میں بقول علامہ آزاد بلگرامی یہاں معقولات کے ایک
نئے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۵۸۶ء میں اکبر بادشاہ نے مدارس میں علوم نقلیہ
(قرآن، حدیث اور فقہ) میں نہایت کمی کر کے علوم مروجہ (فلسفہ، طب، ریاضی
نجوم، ہیئت اور کیمیا) کی تدریس کے احکامات جاری کر دیئے۔ اور اس کے لئے
بیرونی ممالک سے ماہرین تعلیم بلوائے۔ ان اہم تبدیلیوں کے نتیجہ میں عہد اکبری
کا نصاب صرف علوم عقلیہ کا مجموعہ ہو کر رہ گیا جس میں پندرہ کتابیں صرف منطق
فلسفہ اور کلام کی شامل تھیں۔ اور اس کے مقابل نقلی علوم جو اصل غایت
و مقصود ہیں ان میں صرف بیضاوی اور مشکوٰۃ کا ذکر ملتا ہے
تعجب ہے کہ عربی نصاب تعلیم میں جن نقائص اور خامیوں کا آج عام احساس
کیا جا رہا ہے۔ علامہ ابن خلدون کی نگاہ بصیرت نے چودھویں صدی عیسوی میں
ہی اس کی نشاندہی کر دی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے شہرۂ آفاق مقدمہ تاریخ میں
رقم طراز ہیں —
"وہ علوم جو دوسرے علوم کا آلہ ہیں۔ مثلاً عربیت اور منطق
وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ فلاں علم کا

آلہ ہیں۔ ان میں نہ کلام کو وسعت دینی چاہیئے نہ مسائل کی تفریع کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ایسا کرنا اس کو اصل مقصد سے خارج کر دیتا ہے۔ ..... ان علوم آلیہ میں مشغول ہونا عمر ضایع کرنا ہے۔ اور لایعنی کام میں مشغول ہونا ہے۔ جیسا کہ متاخرین نے نحو، منطق اور اصول فقہ کے متعلق کیا۔"

عہد جہاں گیری میں یکایک ہوا کا رخ کچھ بدلا.. اور شیخ عبدالحق محدث دھلوی اصلاح کا علم ہاتھ میں لے کر نمودار ہوئے۔ پھر ان کا قلم عمر بھر قرآن و حدیث کے اسرار و حکم کی کشف و تحقیق میں گہرافشانی کرتا رہا۔ تاکہ عام اہل علم کے معقولی رنگ میں ڈوبے ہوئے دل و دماغ میں احساس کی لہریں پیدا ہوں۔ اور وہ منتہائے مقصود علوم کی تحصیل کے لئے تیار ہوں۔ بلاشبہ یہ ایک مشکل و دشوار کام تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ شیخ محدث کو ہندوستان میں ترویج حدیث کے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تاہم انکے اس اہم کارنامے سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے اس سرزمین میں حدیث کی تخم ریزی ضرور کر دی۔ جو بالآخر شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ عالیہ کی جد و جہد سے شجر بار آور ثابت ہوا۔

عالمگیر کے عہد میں فرنگی محل کے خانوادۂ فضل و کمال کے ایک نامور فرزند ملا نظام الدین سہالوی نے اسلامی مدارس کے لئے ایک نیا نصاب درس مرتب کیا جو آج بھی باوجود ترمیم و اضافے کے "درس نظامی" کے نام سے معروف ہے اور ڈھائی سو سال گذر جانے کے باوجود کلکتے سے پیشاور تک کے بیشتر عربی مدارس میں مروج ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ جب ملا نظام الدین نے یہ نصاب رائج کیا تھا۔ اس وقت بلاشبہ یہ ایک اہم کام انجام پایا تھا۔ اور بحر العلوم عبدالعلی، قاضی حمداللہ، محب اللہ بہاری، قاضی مبارک اور ملا حسن جیسے اعیان علم و فن اسی نصاب کے فیض یافتہ تھے۔ لیکن پھر اسی نصاب سے جو ذہنی و فکری اور علمی و مذہبی

انحطاط پیدا ہوا اس کا مشاہدہ برابر ہو رہا ہے۔ اس کے منجملہ اور اسباب کے ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ قدیم نصاب میں معقولات کی جو بیس پچیس کتابیں داخل تھیں بعد میں انھیں بھی ناکافی تصور کرکے مزید اضافہ کیا گیا۔ اور علوم نقلیہ کو محض دورے کی شکل میں پڑھا دینا کافی سمجھا جاتا ہے یہ صورت حال ہندوستان کے کم وبیش تمام عربی مدارس میں اب بھی نظر آتی ہے۔

منطق و فلسفہ کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن جس طرح زمانہ سابقہ میں اس فن کی صرف دو کتابیں داخل نصاب تھیں۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں بھی یہ علوم صرف اسی حد تک پڑھائے جائیں جتنی عملی زندگی میں ان کی ضرورت پیش آئے بس پھر اس کے بعد نقلی علوم کے اسرار و رموز اور معرفت و حکمت کے خزانے طالب علم کے سامنے الٹ دیئے جائیں جن سے وہ اپنے جیب و دامان کو مالا مال کرلے۔

عربی مدارس کے موجودہ نصاب درس میں ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ اس میں "زمانے کا احساس" مفقود ہے۔ قدیم نصاب کا عہد بعہد جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہر زمانہ کا نصاب تعلیم اس عہد کے مخصوص رجحانات اور میلانات کا آئینہ دار تھا۔ لیکن ڈھائی صدی قبل ملا نظام الدین نے جو نصاب درس رائج کیا تھا وہ اس طویل ترین مدت سے تقریباً جوں کا توں قائم ہے رفتار زمانہ نے جو نت نئے تقاضے پیدا کئے ہیں اس کی روح کہیں نظر نہیں آتی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں انجمن ندوۃ العلماء نے تعلیمی نظام کے قدیم ڈھانچے میں تغیر پیدا کرنے کے لئے اپنا دارالعلوم لکھنؤ میں قائم کیا تو غالباً یہ پہلی کوشش کی جس نے صدیوں کے جمود کو توڑا اور پرسکون سمندر میں ارتعاش پیدا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ندوہ نے اپنے مقصد قیام کو بڑی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی لیکن اس اعتراف کے ساتھ یہ عرض کئے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ اس ادارے نے

ادبیاتِ عربی کو کچھ اس طرح اپنے نصاب میں فوقیت دی کہ وہ محض ایک رد عمل ہو کر رہ گیا۔ یعنی قدیم نصاب میں عربی ادب سے بے اعتنائی اور معقولات سے شغف جس حدِ غلو تک پہونچا ہوا تھا۔ بعینہٖ وہی صورت ندوہ کے نصاب میں عربی ادبیات کو حاصل ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اس مثالی درسگاہ اور مرکزی ادارے سے اہلِ قلم ادبار، صحافیوں اور عربی ادب کے ماہرین کی ایک پوری نسل تو تیار ہو کر نکلی۔ لیکن ابھی تک اس کی زمین سے کوئی ممتاز فقیہ، محدث اور مفسر ایسا نہ اٹھ سکا جو اپنے علم و فضل سے ایک عرصہ عالم پر چھا گیا ہو۔ بایں ہمہ ندوہ کا یہ کارنامہ یقیناً یادگار رہے گا کہ اس نے قدامت پسند علماء میں بھی زمانے کا احساس تازہ کر دیا۔

اصلاحِ نصاب اور طریقۂ تعلیم کے سلسلہ میں اسلام کے اختر تاباں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام بہت ممتاز ہے۔ انھوں نے اپنی متعدد تصانیف میں تعلیم و تعلم کے بارے میں ماہرین کی رہنمائی فرمائی ہے۔ ان خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ جو طریقۂ تعلیم کے سلسلہ میں متعلمین کے لئے مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔ ان نئے علوم کو روشناس کرایا جو کتاب و سنت کی تفہیم میں معاون بن سکتے ہیں اور ان طریقوں کا ذکر کیا جو نظامِ تعلیم میں نئی تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب ملا نظام الدین فرنگی محلی کے معاصر تھے۔ عہدِ عالمگیری کے آخر میں ولادت ہوئی۔ عالمگیر کے بعد متعدد حکمرانوں کے نشیب و فراز دیکھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عہدِ مغلیہ کے آخری سلاطین میں اپنے اسلاف کی طرح شاہین کا جگر اور عقابی قوتِ پرواز باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انکی تلوار صیقل زدہ ہونیکے بجائے کند ہو چکی تھی۔ اور انہیں بہتر تنگ کے بجائے صرف نااہلی کا حل ترنگ رہ گیا تھا۔ مذہبی ہونیکے باوجود ان میں مذہب کی اصل روح نہ تھی۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہدِ زوال میں وہی علوم فروغ پا رہے تھے جو کسب معاش میں معاون ثابت ہو سکیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اس عہد کی تعلیمی حالت

کی بہت عمدہ تصویر کھینچی ہے رقمطراز ہیں۔

"مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پر شور تھا۔ فقہ و فتاوی کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق ۔ ۔ ۔ ۔ سب سے بڑا مذہبی جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار سے بے خبر تھے۔"

اپنے عہد کے ان تعلیمی حالات کو دیکھ کر شاہ صاحب کا دل درد و اضطراب سے تڑپ اٹھا۔ وہ اپنے ایک مکتوب سامی میں ہم عصر علماء کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اے بد عقلو! جنھوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو۔ اور صرف، نحو اور معانی میں غرق ہو اور سمجھتے ہو کہ یہی علم ہے۔ یاد رکھو علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے۔ یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔ چاہیئے کہ قرآن سیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضور کی پوری روش کی پیروی کرو اور آپ کی سنت پر عمل کرو۔"

"الجزء اللطیف" میں شاہ صاحب نے اپنی درسیات کی جو فہرست درج کی ہے اس سے ان کے تعلیمی نظریے کی تعیین میں کافی مدد ملتی ہے۔ وہ فہرست حسب ذیل ہے۔

نحو : کافیہ، شرح جامی۔

منطق : شرح شمسیہ، شرح مطالعہ

فلسفہ : شرح ہدایۃ الحکمہ

کلام : شرح عقائد نسفی۔

فقہ : شرح وقایہ، ہدایہ کامل

اصول فقہ : حسامی۔

بلاغت : مختصر، مطول

طب : موجز القانون

حدیث : ترمذی کامل، مشکوۃ شریف، صحیح بخاری۔

تفسیر : مدارک، بیضاوی۔

یہاں ایک بات خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کی تائید مذکورہ بالا نصاب سے بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ شاہ صاحب جس وقت طلب علم کی منزلیں طے کر رہے تھے ملک کی عام تدریسی فضا پر معقولات کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن جیسا کہ شاہ صاحب نے خود ہی "انفاس العارفین" میں تصریح کی ہے کہ معقولات میں انھوں نے جو کتابیں پڑھیں ان کی کل کائنات یہ تھی۔

منطق میں : قطبی اور شرح مطالع

فلسفہ میں : شرح ہدایۃ الحکمہ

ہندسہ و حساب میں : بعض مختصر رسالے

بس۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام تعلیم کے متعلق شاہ صاحب کا جو مخصوص نظریہ ہے اس کی تخم ریزی شاہ عبدالرحیم صاحبؒ ہی نے کر دی تھی۔ جن سے شاہ صاحب نے تحصیل کی تھی۔ اہل نظر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں صحاح ستہ کی تدریس کا رواج اسی وقت سے ہوا ہے۔ جب شاہ صاحب اور ان کے نامور اخلاف نے اسکو اپنی محنتوں سے رواج دیا۔ اور اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اس راہ میں صرف کر دیا۔

شاہ صاحب نے اپنے عہد کے تعلیمی حالات کا غائرانہ جائزہ لینے کے بعد اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مروجہ طریقہ تعلیم اور نصاب درس قطعی ناقص اور غیر مفید ہے۔ مبدأ فیاض سے انھیں خوب و ناخوب کو پہچاننے کا خاص ملکہ بھی ودیعت ہوا تھا۔ "الجزء اللطیف" میں اپنے خود نوشت حالات زندگی میں رقمطراز ہیں۔

"اس کے علاوہ مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا ہے جس کے ذریعہ سے میں یہ تمیز کرسکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے۔ اور وہ کون کون باتیں ہیں جو بعد میں اس میں ٹھونسی گئی ہیں یا جو کسی بدعت پسند فرقے کی تحریف کا نتیجہ ہیں۔"

شاہ صاحب اپنے نظریہ تعلیم کی مزید وضاحت اور درس نظامی کے متعلق اپنے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے "وصیت نامہ" میں لکھتے ہیں۔

"تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ طریق تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ پہلے صرف و نحو کے تین تین چار چار درسی رسائل طالب علم کی استعداد اور ذہن کے مطابق پڑھائے جائیں۔ اس کے بعد تاریخ یا حکمت کی کوئی کتاب پڑھائی جائے جو عربی زبان میں ہو اور تعلیم کے وقت معلم کتب لغت کا طریقہ اور اس کے مشکل مقامات کے حل سے طالب علم کو مطلع کرتا رہے جب طالب علم کو عربی زبان پر قدرت ہو جائے تو مؤطا بروایت یحیٰی بن یحیٰی مصمودی پڑھائی جائے۔ اسے کسی حال میں نہ چھوڑا جائے۔ یہ علم حدیث کی اصل و اساس ہے......

اس کے بعد قرآن عظیم کی تعلیم دی جائے۔ اس طور پر کہ بغیر تفسیر کے صرف ترجمہ پڑھایا جائے۔ مگر جہاں کہیں شان نزول یا قاعدۂ نحویہ میں کوئی مشکل پیش آئے وہاں رک جائے۔ اور پوری طرح اس مقام کو حل کیا جائے اس کے بعد تفسیر جلالین بقدر ضرورت پڑھائیں۔ اس طرح پڑھانے میں بڑا فیض ہے۔ اس کے بعد ایک کتاب حدیث مثلاً صحیح البخاری یا صحیح مسلم وغیرہ اور کتب فقہ، عقائد و سلوک وغیرہ پڑھائیں۔ اور دوسرے وقت کتب دانشمندی پڑھائیں۔ مثلاً شرح ملا قطبی ۔ الا ما شاء اللہ۔"

"اگر ممکن ہو تو طالب علم ایک دن مشکوۃ پڑھے اور دوسرے دن شرح طیبی

جس قدر پہلے دن مشکوۃ پڑھی تھی - یہ نہایت نفع بخش ہے "
شاہ صاحب کے متذکرہ صدر "وصیت نامہ" کا تجزیہ کرنے سے کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں -

۱- شاہ صاحب کے نزدیک نصاب درس میں اولیت اور سب سے زیادہ اہمیت گرامر (صرف ونحو) کو حاصل ہے - اور اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہو جائے - اور دوسرے فنوں کی مشکل کتابوں کے حل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے -

۲- تحصیل حدیث میں مؤطا امام مالک کو فوقیت دی جائے - اور اس میں بھی نسخہ مصمودی پر اعتماد کیا جائے - بقول شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی " جن ائمہ نے مؤطا کو امام مالک سے روایت کیا ہے - ان کی تعداد ایک ہزار ہے" لیکن ان تمام روایات میں مصمودی (یحیی بن یحیی اللیثی المصمودی المتوفی ۲۳۲ھ) کی روایت کو معتبر ترین اور معقول ترین قرار دیا جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب نے مؤطا نسخہ مصمودی کی تدریس پر یہ کہکر خصوصی توجہ دی ہے کہ " اسے کسی حال میں نہ چھوڑا جائے کہ یہ حدیث کی اصل واساس ہے "

۳- علم حدیث میں مؤطا کی تحصیل کے بعد پہلے قرآن کا صرف ترجمہ اور پھر تفسیر کا درس دیا جائے -

۴- اس کے بعد حدیث کے دوسرے مستند ذخائر سے استفادہ کیا جائے یعنی صحاح ستہ اور مسانید وسنن -

۵- اس "وصیت نامہ" کی سب سے زیادہ لائق ذکر بات یہ ہے کہ شاہ صاحب نے معقولات کا ذکر تمام علوم کے بعد نہایت غیر اہم انداز میں کیا ہے اور اس میں صرف ایک کتاب شرح ملا قطبی پڑھ لینے کو کافی خیال کیا جاتا ہے -

آج اسلامی مدارس کے حلقہائے درس مذاہب اربعہ کی فقہی بحثوں اور اختلافات سے
نوبجتے رہتے ہیں جس کے باعث طلبا ۔ کے فکر و ذہن میں ریب و شک کے ساتھ بہت سی گتھیاں
الجھ کر رہ جاتی ہیں ۔ شاہ صاحب کا فلسفۂ تعلیم اس سلسلہ میں بھی جدا ہے ۔ وہ ائمہ اربعہ
ے اقوال کو جمع کر کے ان میں باہم تطبیق پیدا کرنے کے قائل ہیں ۔ چنانچہ وہ حنفی، شافعی، اور
مالکی تینوں مذاہب کو ایک ہی درجے پر مانتے ہیں ۔ اور اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ان
مسالکِ ثلاثہ کا منبع و سرچشمہ مؤطا امام مالک ہی ہے ۔ کیونکہ امام محمد رحمن کی کتابوں سے
وہ حنفی فقہ کو اخذ کرتے ہیں) اور امام شافعی دونوں امام مالک کے ارشد تلامذہ میں
تھے ۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے ۔ مؤطا کی اسی اہمیت کے باعث وہ علم حدیث میں اس کی
تدریس کو لازمی قرار دیتے ہیں ۔

اگر تدریسِ فقہ کے وقت شاہ صاحب کا یہ اصولِ تطبیق پیشِ نظر رہے تو اس
غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے گا ۔ کہ ہر فقہی مسلک ایک جداگانہ ملت کا حامل ہے ۔ بلکہ
حقیقت یہ ہے کہ تمام مکاتبِ فکر اصل شریعت مطہرہ کے مختلف شعبے ہیں جن کا ماخذ و
منبع ایک ہی ہے ۔ اس طرح سے بہت سے احکام کے بارے میں ذہن انتشارِ فکر اور
شکوک و شبہات سے محفوظ رہے گا ۔

" عقد الجید " میں جہاں شاہ صاحب نے عالم متبحر کی تعریف کی ہے ۔ اس میں کہیں بھی
معقولات میں مہارت کا ذکر نہیں ملتا ہے، جس سے موجودہ زمانے کے اس عام خیال
کی تردید ہو جاتی ہے کہ علماء کا طغرائے کمال دراصل منطق، کلام اور فلسفہ و حکمت
ہیں ۔ چنانچہ شاہ صاحب رقمطراز ہیں ۔

" عالم متبحر وہ ہوتا ہے جو صحیح الفہم، عربی زبان سے واقف
اسالیبِ کلام اور مراتبِ ترجیح کا عارف اور کلامِ عرب
کے سمجھنے میں نہایت تیز ہو ..... حدیث، فقہ اور تفسیر

کے اسرار و رموز کا واقف کار اور اصول تطبیق پر
عامل ہو۔"

خلاصہ کلام یہ کہ شاہ صاحب کے مذکورہ بالا تعلیمی نظریات درحقیقت ایک طویل مشاہدہ اور تجربہ کا نچوڑ ہیں۔ اس لئے یقیناً وہ اس لائق ہیں کہ ان کی روشنی میں قدیم نصاب درس میں مفید و کارآمد اصلاحات نافذ کی جا سکتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک کسی مرکزی عربی دارالعلوم نے ولی اللہی طریقہ تعلیم کو دلیل راہ نہیں بنایا ہے۔ خود دارالعلوم دیوبند جو فکر ولی اللہی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ درس نظامی کو اپنا دین و ایمان بنائے ہوئے ہے۔ اور اس کے نصاب درس میں آج کافی تبدیلی و ترمیم کے بعد بھی معقولات کی بکثرت کتابیں داخل ہیں۔

بہر حال اگر شاہ صاحب کے طریقہ تعلیم کو اپنایا جائے تو قوی امید ہے کہ طلبار کا ذہنی جمود، مذہبی تنگ نظری اور پست ہمتی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جو قدیم نصاب کی دَین ہے۔ اور اس کے بجائے نئی نسل کے فکر و نظر میں وسعت، ان کے مذہب و عقیدہ میں پختگی، رواداری، عالی ہمتی اور خیالات میں عقابی قوت پرواز پیدا ہو سکتی ہے۔"

بقیہ صـ۲۲۴ کا

اس تبصرہ میں راقم الحروف نے ڈاکٹر خالدی صاحب کی اہم اور فاش غلطیوں پر گرفت کی ہے۔ ترجمہ کی معمولی بے احتیاطیوں کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن اسکے باوجود تبصرہ خاصہ طویل ہو گیا۔ اسکی وجہ میری یہ خواہش تھی کہ یہ مقالہ صرف "غلط نامہ" نہ ہو کر رہ جائے بلکہ قارئین برہان کیلئے مفید اور معلومات افزا ہو۔ آخر میں ایک بار پھر میں ڈاکٹر ابو النصر خالدی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انکے خلوص نیت اور حق جوئی و حقیقت طلبی نے میرے لئے آثار عمرین کے تحقیقی مطالعہ کا قیمتی موقع فراہم کیا۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين ۔